’واقعہ‘ اور ’’کلامیہ‘‘ کی ادبی حیثیت

ڈاکٹر غلام شبیر اسدؔ

Dr. Ghulam Shabbir Asad

Department Urdu Adbiyaat,

Govt. Post Graduate College, Jhang.

Abstract:

The debate of literary and non-literary is as old as that of word and meanings in the history of men's writing and is going on since time immemorial. The logics have always been presented in the favour and against it now this debate has taken the form of two proper schools of thought. This article premises some orientations of this topic. The opinions of the critics of the East and West bearing literature for the sake of Literature have been presented as a rationale so that the distinction between literary and non-literary may be clarified.

انسان بحیثیت ایک زندہ وجود جو کچھ کرسکتا ہے (بہ طور خاص فکری ترفع کے حوالے سے ہر سطح پر) وہ سب دراصل صورت کے آثار کے سبب سے ہے یہ آثارِ صورت خواہ حقیقی، خارجی، عینی، ملفوظی، کتبی یا ذہنی ہوں جملہ مظاہر فطرت سے اس کا تعلق یا تصرف اپنی صلاحیتوں کے حسبِ حال ہوتا ہے۔ ہر وجود میں آثار کا ایک لامتناہی سلسلہ ہوتا ہے ان آثار کے جس قدر درجات ہیں اُسی قدر انسانی ذہن کے ترفعات کی سطحیں ہیں۔ ہر سطح اپنے تردادات کے سبب سے کسی درجہ وجود سے منسلک ہو کر انسان کا ’’ہونا‘‘ ثابت کرتی ہے۔ بعض حضرات موجود و دستیاب سے اپنے رشتے یا ان کے مابین تعلق کے بیان کو ہی کافی شافی سمجھ کر ہی اپنی فکری سطحوں کی محدود حدود کو ہی معراج سمجھ بیٹھتے ہیں حالانکہ یہ حدٗ بے حد محدود ہے۔ حد تو تب مقرر و معین ہو جب آثارِ وجود کے جملہ تلازمات ہاتھ آ جائیں اگر ایسا نہ ہو تو جان لیں کہ ہم سب ابھی راستے میں ہیں، سرِ ساحل ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں تکمیل کا دھارا ابھی ہم سے کوسوں دور ہے ایسے میں دعویٰ (خواہ کسی قسم کا ہو) ورائے عقل ہے فلاسفہ حضرات علت و معلول کے مابین نسبتوں کی تلاش میں ہلکان ہوئے جاتے ہیں مگر حد ہے کہ ان کی صلاحیتوں کی حد سے کہیں آگے ہے ہاں ظاہر ضرور ہے مگر اُن کے فکری محیط سے باہر ہے اس ضمن میں اپنی رائے پر اترانا حقیقت سے بیگانہ ہونے کے مترادف ہے۔

سائنس وجود کی شکل وصورت کی اصل تو تلاش کرسکتی ہے مگر اس کی آخری شکل کیا ہوگی معلوم نہیں کرسکتی وجہ یہ ہے کو موضوع اپنی بے کرانی میں نہاں اور معروض اپنی حدود میں غلطاں، اپنی ہی کسی حد کو فکرِ فراواں خیال کرنا دراصل وقوف سے جانا ہے ہاں مگر ہم جہاں تک ہیں وہاں تک کے آثار کو موثر پیرائے میں بیان کرنا اپنے حصّے کی خیر کا استعارہ ہے۔ اس ضمن میں لفظ و معنی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ لفظ (ادب میں برتا ہوا لفظ) ایک کائنات کے مصداق ہے جو اپنی ہیئت و برتاؤ کے متعدد آثار کا

حامل ہوتا ہے۔لفظ خود مکتفی نہیں ہوتا بلکہ لوح اس کے آثار محفوظ کرتی ہے۔ یہ برتنے والے پر منحصر ہے کہ اس نے لفظ کے کون سے آثار بروئے کار لائے اور کن معنوں میں لائے۔۔۔سنجیدہ قرات ہی اس کے آثار کے درجات کو تلاش سکتی ہے بہ صورت دیگر معرفت کی لذت سے آشنا ہونا محال رہے گا۔

حالت و کیفیت میں حدِ فاصل الفاظ ہی کے دم سے ہے۔سماجی ذہن الفاظ کو عموماً سماجی ضرورتوں کی ضمن میں استعمال کرتا ہے یا پھر سماجی مظاہر کے مابین تعلقات کی نوعیت کے بیان کو ہی اپنے علمی فضیلت جانتا ہے۔مگر ادب میں ایسا کچھ نہیں ہے۔ادب کی ابتدا ہی تہذیب سے ہوتی ہے اور ادب میں الفاظ کا استعمال تقریبِ ذہن کے لیے ہوتا ہے جو بالآخر وجود و ذہن کی سرکشی و سرتابی کو حاوی ہو جاتا ہے اب جب بھی کوئی مہذب تخلیق کار لفظ کو بروئے کار لائے گا تو تاثیر کے کئی پہلو سامنے آئیں گے۔مثلاً عصائے موسیٰ اپنی مقامی قیمت میں ایک چھڑی کے سوا کچھ نہ تھا مگر اعجازِ دستِ موسیٰ نے اسے کیا سے کیا بنا دیا۔ عصا ایک مظہر ہی تو تھا مگر متصرف نے اسے کیا سے کیا بنا دیا بعینہٖ ایک تخلیق کار مؤثر و معجز بیان ہوتا ہے جب وہ عام لفظوں کو خاص معنوں میں استعمال کرتا ہے تو قاری و سامع کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اشیاء اپنے اسماء سے علم میں ڈھلتی ہیں۔بظاہر اشیاء ٹھوس وجود کی حامل ہوتی ہیں جب تخلیق کار کی نظر سے گزرتی ہیں تو بے حد نرم و کومل و ریشم کے مصداق ہو جاتی ہیں کولرج کے مطابق قلبِ شعر میں ''تمام علوم کی خوشبو'' (۱) بن جاتی ہیں اور اگر کسی ایک مظہر کے لطائف تخلیق کار عیاں کرے تو کئی ایک صفحات پر بار کیے جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ (حواس) حسیت، منطق کی اکائی ہے جو واقعہ یا مثالِ واقعہ سے آگے کی بصیرت سے عاجز ہے۔ واقعات، سانحات کے نتیجے میں سامنے آنے والا ادب خود مختار و خود مکتفی نہ ہوگا۔ بلکہ دوسرے کا حاصل، نتیجہ، عکس یا طفیلیہ ہوگا اس کا خالق، خالق نہیں بلکہ محرر ہوگا مصنف نہیں اور اس ایسی تحریروں سے انبساط تاریخی، روایتی جبر کے تابع ہوگا۔محرر ہمیشہ ''ہو رہے یا ہو چکے'' کی زد میں رہتا ہے اور اسی میں ہی اپنے مقاصد کی تکمیل کرتا ہے اور ترسیل کو فخر جانتا ہے جو فریب خود نمائی و خود ستائی کے سوا کچھ نہیں۔حسیت کا تقاضا وجود ہے وجود کے ہزار مظاہر ہیں۔ ہر مظہر، مظہرِ فطرت ہو یا صنعت گری کا نتیجہ ہو وجود ہی کا مرہونِ منت ہے۔دراصل ہر ''شئے'' اپنے جوہر کا مظہر ہے اور محرر کی بینائی مظہر ہی کو محیط ہوتی ہے، جوہر کو نہیں۔مظہر متعین ہے اور جوہر امکان ہے۔موجود کے ممکنات، محرر کی حد ہے جو کہ مقلدانہ روش یا نقل سے زیادہ نہیں جبکہ امکان، لا وجود، لا زمان و لا مکان ہے جس کی طرفیں، سطحیں متخیّلہ کی فعال صورت ہے بہ الفاظ دیگر شئے، ٹھوس ہے۔اس کا پرستار محرر ہے جبکہ جوہر لطیف ہے جو صرف متخیّلہ کی گرفت میں آ سکتا ہے۔لطفِ جوہر ''کلامیہ'' ہے جبکہ شئے یا وجود کی طرفیں ''واقعہ'' ہے۔محرر کی قوتِ جذب، ادراک و تفہیم کے اپنے اصول رکھتی ہے تاریخی، ثقافتی اور نظری اعتبار سے محرر کی تحریر کو ادب مان لیا جائے تو یہ طفیلیہ ادب ہوگا تخلیقی ادب ہرگز نہیں۔ایسے ہی ادب کے بارے میں مجنوں گورکھ پوری نے دوٹوک موقف اختیار کیا ہے ''ادب یا حسن کاری اگر زندگی کی محض سادہ نقل ہے تو یقیناً ایک فعلِ عبث ہے''۔(۲) یارانِ نکتہ دان تو یہ بھی فرماتے ہیں کہ باتیں سب ہو چکی ہیں بس ''انہی ہو چکی'' باتوں کو اپنے انداز میں کہنا ہی باقی رہ گیا ہے مطلب تخلیق کا عمل اٹھ چکا کچھ نیا کہنا بدعت ہوگا بس کہے کو کہے جانا ہی تخلیق کاری ہے غور کریں ایسی تخلیق کاری کا دعویٰ اقرارِ جہالت کے سوا کیا ہے؟ کولرج کے مطابق ''تخلیق کار کا موضوع عام دلچسپیوں اور حالات سے دور ہونا چاہیے'' (۳) ادھر ایک صاحبِ حال کا کہنا ہے:

ایک ہی حادثہ تو ہے اور وہ یہ کہ آج تک
بات نہیں کہی گئی بات نہیں سُنی گئی(۴)

حقیقت یہ ہے کہ واقعاتی ادب موجود کا فقط آئینہ ہے بینائی کے محیط کی کہانی ہے منفعل ہے فعال نہیں مقتدی ہے رہبر و راہ ساز نہیں جو ادب مقلدانہ روش سے ظہور پذیر ہو وہ دنیا کو کیا خاک بدلے گا۔تبدیلی وانقلاب، راہ سازی کے لیے تو لازم ہے موجود صورتِ حال سے ہٹ کر کوئی اور موقف اختیار کیا جائے، نئے ضابطے وضع کیے جائیں پامال وروایت گزیدہ راستوں کو منہدم کیا جائے خواہ وہ کتنے ہی معتبر ومضبوط ہی کیوں نہ ہوں پرانی شاہراہوں کو خیر باد کہہ کر نئی راہ وضع کرنا ہوگی (خواہ وہ پگڈنڈی ہی کیوں نہ ہو)

حِس کا نتیجہ واقعہ ہے اور واقعہ کا نتیجہ تحریر ہے جس کا فاعل محرر ہے۔ جو کچھ ماحول میں رونما ہو رہا ہوتا ہے اسی سے حسی تاثیر قبول کرتا ہے اور بہ زعمِ خود اپنی پیش کش کو تخلیق جانتا ہے حالانکہ ایسی پیش کش تاثیر کے جملہ لوازمات سے وراجذباتی اور سطحی ہوتی ہے ایسی پیش کش اسلوبِ رفتہ وگزشتہ، روایتی ہیئت، متداول لفاظی، تفہیم مروّجہ کی حامل ہوتی ہے کردار و بیانیہ ٹیپ کے مصرعے کی طرح ہوتے ہیں ایسا ادب کسی بھی واقعہ پر فوری اور عوامی ردِعمل سے زیادہ نہیں ہوتا مثلاً جنگِ عظیم اوّل ودوم، ہجرت کے واقعات، نائن الیون، سونامی، دہشت گردی کے نتیجے میں ظہور پذیر تحریریں، محرر کے تردات وترفعات کی زندہ مثالیں ہیں۔ بعض ستم گروں نے تو ایسی سطحی تحریروں کے محرروں کو درویش دوراں تک کہہ دیا ان کے نزدیک روایتی انداز ہی دراصل اندازِ صوفیانہ ہے ایسوں کے نزدیک اگر کہیں نئی بات یا کسی سطح کا نیا قدم سامنے آئے تو وہ لازماً اندازِ کافرانہ کی حاصل جمع ہوتا ہے۔ جب ادب و نا ادب میں تمیز ہی اٹھ جائے تو پھر یہی کچھ ہوتا ہے دوران، گفتگو ڈاکٹر لیاقت علی مؤثر سے میں نے عرض کیا کہ کلاسک، جدید ادب پر سادات عظام کے بڑے احسانات ہیں انھوں نے برملا جواب دیا کہ ''اُن احسانات کا قرض سادات عصرِ حاضر نے چکا دیا ہے۔''(۵) اُن کی بات بڑی معنی خیز تھی یقیناً جب موضوع ومعروضِ حسیّات تک محدود ہو جائیں تو نئی فکر کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں اور حالتِ حال (عصرِ حاضر) کے سبب حالتِ حال (تخلیقی وارفتگی) بھی حالات کی نذر ہو جاتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ ناظر کبھی بھی کیفیات کا ادراک نہ کر سکے گا بالکل اسی طرح جیسے الفاظ کی زد میں آیا ہوا شخص لطفِ معنی سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا ایسے حضرات کا فکری دائرہ تجسیم سے تجسیم تک ہی رہتا ہے کسی تجرید کو تجسیم کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہوتی وہ صرف مظاہرِ فطرت یا سماجی مظاہر سے تعلق کی نوعیت یا اُن کے مابین پائے جانے والے تعلقات اور رویّوں کی متوازن وغیر متوازن زیروزبر کو ہی زیرِ بحث لاتے ہیں یا لا سکتے ہیں۔ان کی مثال ایسے چراغوں کی سی ہے جو روشنی سے زیادہ دھواں دیتے ہیں۔اس کے برعکس بلیک کہتا ہے کہ ''میں اپنے متعلق یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ میں خارجی کائنات کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا میرے لیے تو وہ ایک مزاحمت ہے نہ کہ ممدِ عمل۔''(۶) جبکہ ماورائے حس کا نتیجہ امکان ہے۔امکان متخیّلہ سے ہے متخیّلہ کا روادار تخلیق کار ہے تخلیق کار جو ہر کے صرف فکری ابعاد ہی تلاش نہیں کرتا بلکہ لفظ ومعانی کا اِک نیا جہان متعارف کرواتا ہے وہ حِس و ماورائے حِس کو محیطِ کلی وژن کا حامل ہوتا ہے اور ہر معلوم ومعدوم، خفی وجلی سے اور طرح کا تقاضا کرتا ہے، جو نظروں کی زد میں نہیں ہے اسی کی جستجو کرتا ہے۔

ادب اور نا ادب، تخلیق کار اور حقیقی تخلیق کار کے مابین تفاوت پر ڈاکٹر ناصر عباس نیّر کا مؤقف، فکر کی دعوت دیتا ہے، لکھتے ہیں:

''حقیقی تخلیق کار دراصل دنیا کا کلّی تصور رکھتے ہیں وہ محرروں کی طرح دنیا کا محض حسی تجربہ نہیں کرتے بلکہ وہ حسی اور فکری سطحوں پر بہ یک وقت متحرک ہوتے ہیں اور اس تحرک کو اپنی متخیّلہ کے آہنگ میں جذب کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔ وہ دنیا کے واقعات اور رائج کلامیوں دونوں پر نگاہ رکھتے ہیں۔ واقعہ کی حسیت و جسمانیت اور کلامیے کی فکریت ان کی گرفت میں ہوتی ہے۔ چناں چہ وہ محض واقعہ نہیں لکھتے، واقعہ کی منطق کو بھی کچھ اس طور پر پیش کرتے ہیں کہ وہ نِری منطق نہیں رہ جاتی، واقعے کے ساتھ اس کا رشتہ گوشت اور ناخن کا سا ہو جاتا ہے۔ چوں کہ وہ واقعے کا حسی تجربہ اور منطق کی بصیرت دونوں رکھتے ہیں۔ اس لیے وہ محض ہو چکے واقعات اور ان سے منسلک منطق کو پیش کرنے کے پابند اور مجبور نہیں ہوتے۔ وہ خود واقعے تخلیق کر سکتے، نیا حسی تجربہ کر سکتے اور نئی منطق تراش سکتے ہیں اور نئی ہئیتیں، نئے اسالیب اور نئی علامتیں تخلیق کر سکتے ہیں۔ وہ موجود واقعات کو مسترّد اور رائج منطق کو ردّ کر سکتے ہیں۔ لہٰذا وہ ایک ایسا کلی وژن رکھتے ہیں جو بہ یک وقت معلوم اور نا معلوم، حس اور ماورائے حس، دونوں کو محیط ہوتا ہے۔ کلی وژن سے نمود پانے والا ادب بدلتی دنیا کا کلی فہم ہی نہیں دیتا، تبدیلی کی جہت کا وسیع انسانی تناظر میں محاکمہ بھی پیش کرتا ہے۔ اس طور یہ ادب مثالی طور پر کسی ایک مقتدر گروہ کی حکمت ہائے عملی اور کلامیوں میں شریک ہونے کے بجائے انسانی مسرت و فلاح کا وسیع تصور دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ادب کس مقتدرہ کے نظریے یا مقاصد کا آلہ کار نہیں بنتا بلکہ آزادانہ حیثیت میں بدلتی دنیا سے متعلق ایک اپنا مؤقف پیش کرتا ہے۔''(۷)

مابعد جدید مفکّرین میں رولاں بارت کا نام بڑا معتبر ہے اُس نے ،لکھت،لکھاری اور قاری کی تثلیث پر اپنے فکری نظام کو استوار کیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق، بارت نے سب سے پہلے لکھاری کا ذکر کرتے ہوئے Ecrivantاور Ecrivain کی نشاندہی کی ہے اور کہا ہے کے مقدم الذکر، کم تر اور مؤخر الذکر برتر ہے۔ اِس کے بعد اُس نے لکھت کا ذکر کرتے ہوئے اِسے Readerly اور Writerly میں تقسیم کیا ہے اور یہ موقف اختیار کیا ہے کہ مقدم الذکر، عام مگر مئوخر الذکر خاص ہے۔ آخر میں اُس نے قرات پر توجّہ مرکوز کرتے ہوئے قاری کو لذت کوش اور آنند کوش میں تقسیم کر دیا ہے اور یہ تاثر دیا ہے کہ قرات کے دوران میں آنند اور غایت اِنبساط کے جولمحات آتے ہیں، وہی قرات کا ثمرِ شیریں ہیں۔ چناں چہ اُس کا نظامِ فکر اِن دوخانوں میں بٹا ہوا نظر آتا ہے:

1. Plaisir, Readerly, Ecrivant
2. Jouissance, Writerli Ecrivain(8)

اسی عام و خاص کی تقسیم کو ''ادب برائے زندگی'' اور ''ادب برائے ادب'' کے تناظر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے اوّل الذکر ادب کو ''ذریعہ'' و ''واقعہ'' کے سوا کچھ نہیں جانتے جبکہ مئوخر الذکر ادب کو مقصود بالذات یا کلامیہ سمجھتے ہیں، اوّل الذکر اپنے وضع کردہ مینی فیسٹو/مقصد کے مطابق ہوتا ہے جبکہ مئوخر الذکر ادب کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی

مقتدرہ سے وابستگی یا مقصدیت، آزادانہ عمل اور فعال صورتوں کو گہنا دیتی ہے:

''ادب اگر آئیڈیالوجی کا غلام نہیں ہوتا تو ادب آئیڈیالوجی سے بے نیاز بھی نہیں ہوتا۔ ادبی تخلیق کی جان، آزاد تخلیقی مکالمہ ہے یہ نہیں تو ادب کی کائنات سکڑ جاتی ہے۔''(۹)

لہٰذا حقیقی تخلیق کار کی ذمہ داری ہے کہ وہ زندگی کی عکس بند یا فوٹو گرافر ہونے کے بجائے زندگی کی راہ سازی و راہ نمائی کا فریضہ انجام دے تا کہ فلاحِ انسانیت کے مزید پہلو روشن اور واضح ہوں۔ تخلیق کار کو کسی آئیڈیالوجی کا آلہ کار بننے کے بجائے تقاضائے فن سے نباہ کرنے کا ہنر آنا چاہیے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا خیال بھی یہی ہے۔

''اصل معاملہ شاعری اور شاعرانہ ذات کے اظہار کا ہے اگر آپ وابستہ رہ کر اور اسٹیب لشمنٹ کے فرد بن کر بھی ایسا کر سکتے ہیں تو شوق سے کیجیے، ورنہ خالی خولی ناوابستگی اور اینٹی اسٹیب لشمنٹ کا پوز اختیار کر کے آپ شاعر نہ بن جائیں گے اور یہ بات بھی سمجھ لیجیے وہ لوگ جو بہ یک وقت وابستگی اور اینٹی اسٹیب لشمنٹ کی تعلیم دیتے ہیں سیاست دان ہیں، ادیب نہیں ہیں۔ ناوابستہ ہو کر اینٹی اسٹیب لشمنٹ ہونا ممکن ہے لیکن وابستہ ہوتے ہی آپ فوراً اسٹیب لشمنٹ کی موجود یا موعودہ برادری کے رکن رکین بن جاتے ہیں۔ اس لیے اصل گناہ وابستگی کا گناہ ہے آپ اس کے مرتکب نہ ہو تو آپ کی شاعرانہ عاقبت میں فلاح ہی فلاح ہے۔''(۱۰)

فاروقی صاحب کے مؤقف کی اصل یہ ہے کہ ادب واقعہ نہیں کلامیہ ہے پابند نہیں بلکہ آزاد ہے اور یہ سرسری نظر کے نتیجے میں نظر آنے والی ریاضیاتی چیز نہیں بلکہ یہ ایک پیچیدہ و پُر اسرار شئے ہے جسے ظاہر کرنے کے لیے پوری آزادی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ادب و نا ادب میں ازلی کش مکش ہی یہی ہے کہ جو مقدم کو روا ہے وہی موخر کو نا روا ہے ان کے مابین تفریق نہیں بلکہ ضدین ولبعد القطبین ہے یہ ایک دوسرے کی مخالف سمت میں رواں دواں ہیں۔ انہیں یوں بھی الگ کیا جا سکتا ہے ایک جذباتی اور غیر موثر ہے جبکہ پُر احساس اور صریع الاثر ہے ایک حکم بردار ہے جبکہ دوسرا حکم ران ہے۔ رولاں بارت کی زبانی یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ:

''لکھت لکھتی ہے لکھاری نہیں' جب رولاں بارت سے ادب و نا ادب کے بارے سوال کیا گیا تو اس نے جواب دیا ''اس رولاں (رولاں بارت) کے سامنے لکھاری کا نام تک نہ لیا جائے اگر اس سے کچھ پوچھنا ہے تو صرف لکھت کے حوالے سے پوچھا جائے۔''(۱۱)

شاعر و ادیب کے فروعی مسائل سے قطع نظر ان کی حقیقی حیثیت کا ادراک کرتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی کا کہنا ہے:

''وابستگی اور شاعری میں خدا واسطے کا بیر ہے اس کی وجہ نہیں ہے کہ شاعری وابستگی کی متحمل نہیں ہو سکتی بلکہ یہ ہے کہ وابستگی شاعری کو نہیں برداشت کر سکتی یہ اس لیے ہے کہ شاعری جانے بوجھے، پہلے سے سمجھے ہوئے، خارج سے حاصل شدہ، پہلے سے منظور شدہ تجربات کے اظہار کا نام نہیں بلکہ شاعری کی حیثیت ایک انکشاف کی ہے۔ شاعر کو پہلے سے یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ اسے کیا کہنا ہے جو کچھ کہنا ہے وہ خود اس پر بھی اُسی وقت منکشف ہوتا ہے

جب وہ اِسے کہہ لیتا ہے۔''(۱۲)

حقیقت یہ ہے کہ ادب بہر حال تخلیق کا حاصل ہے اور تخلیق بہر طور Finite نہیں ہے تخلیق کو سوچے سمجھے منصوبے کے تحت لانا فعلِ عبث ہی نہیں بلکہ تخلیق کے مزاج کے یکسر خلاف ہے۔ ادب تو ایک ایسا منہ زور بہاؤ ہے جو اپنے راستے خود متعین کرتا ہے مصلحتوں، وابستگیوں کے ثواب آثار زاویے بارگاہِ ادب میں گناہِ کبیرہ کے مصداق ہوتے ہیں اس کی ادائیں اردو شاعری کے معشوق کی کافر اداؤں سے بھی زیادہ پُر کار ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ تخلیق کے تفاعل کو کچھ اس طرح واضح کرتے ہیں:

> ''تخلیق کے حضور میں ہر علم ہر نظریہ جھوٹا، مقید، مجبور اور محدود رہ جاتا ہے۔ ادب کی ہر کہانی infinite کے تفاعل کی نئی داستان کہتی ہے۔ جہاں تجربہ متحیر اور زبان گنگ رہ جاتی ہے۔ ادب کا کام متعینہ اقدار کی پاسداری نہیں۔ ہر فن پارہ کسی نئی سچائی کا اثبات ہے۔ اسی طرح ادب ایسی بصارت اور ایسی بصیرت ہے جو متعینہ علوم کی حدود سے آگے جاتی ہے۔ ادب میں آئیڈیالوجی بھی وہی سچی اور کھری ہے جو متعینہ اور متوقع کو نہ دہرائے بلکہ غیر متوقع کو، اَن جانے اَن دیکھے کو دکھا سکے۔ ادب بے نام کو نام، بے آواز کو آواز دینے کا عمل ہے یا ایسے سُر کو سننے اور گانے کا جو سنگیت کے راز کا محرم تو ہو لیکن پہلے کبھی گایا یا سنا نہ گیا ہو۔''(۱۳)

بلاشبہ حاملِ ادب یا تخلیق کار مقلد نہیں مجتہد ہوتا ہے وہ اپنی فکری کائنات کا خود خالق ہوتا ہے سر فلپ سڈنی نے شاعر یا ادیب کی اِسی حیثیت کو یوں واضح کیا ہے:

> ''صرف شاعر ہی ایسا ہے جو اِن سب چیزوں (موجود) کا غلام ہونے کے بجائے اپنے تصورات کے زور پر ایک نئی فطرت کی تشکیل کرتا ہے۔ وہ یا تو فطرت سے بہتر چیزیں تخلیق کرتا ہے یا ایسی نئی شکلیں تخلیق کرتا ہے جو فطرت کے پاس بھی نہیں ہے۔۔۔ وہ عطیاتِ فطرت کے تنگ دائرے میں بند نہیں رہتا بلکہ آزادی کے ساتھ اپنی ذہانت کے دائرے میں گھومتا رہتا ہے۔''(۱۴)

تخلیقی آزادی پر دلیل ایک نظم کی یہ چند سطریں ملاحظہ ہوں:

ادب کلی کی وہ کھلکھلاہٹ کہ جس پہ قدغن حرام ٹھہرے
بجا کہ بے جا روایتوں سے بھی منحرف ہے
مگر یہ طے ہے
کہ محض جدت کی پیروی سے نہیں عبارت
سخن زمانے کا پیش رو ہے
سخن دیے کی بھڑکتی لو ہے(۱۵)

حقیقت یہ کہ کلامیہ ایک واضع، آزادانہ اور فعال سرگرمی ہے جس کے اپنے تردات و تقاضے ہوتے ہیں جو از خود نئے اور حیرت زا ہوتے ہیں۔ کلامیہ اپنے جملہ مراحل میں جس قدر ماحول سے بے نیاز ہوتا ہے اُسی قدر خود مکتفی بھی ہوتا ہے روایت کا

شعور رکھتا ہے، روایت پرست نہیں ہوتا۔ ماورائی کیفیتوں پر کمند ڈالتا اور وراء الواقعہ ہوتا ہے یہ ذہن کی گہراہیوں سے حیران کُن خیال مجسم کرتا ہے، ہو چکے اور ہو رہے سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ کچھ نئے کا داعی ہوتا ہے۔اس کا مدعا، ذات کے بحرِ بے کراں میں اتر کر کسی نئے امکان کا ادراک ہوتا ہے جو روز مرہ زندگی کے مطابق ہونے کے بجائے متضاد اور متصادم ہوتا ہے۔اور شعور میں تبدیلی لانے، زبان و بیان میں نئی روح پھونکنے کا سبب ہوتا ہے۔اس میں روحِ عصر کے علاوہ ماورائے عصر کے رموز کا حامل ہوتا ہے جس کی وجہ سے یہ دائمی اور آفاقی ہوتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عابد صدیق، مغربی تنقید کا مطالعہ، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۳ء، ص:۱۳۴

۲۔ مجنوں گورکھ پوری، مبادیاتِ تنقید، مشمولہ: نظریاتی تنقید (مسائل و مباحث)، مرتبہ: ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، ملتان: بیکن بکس، ۲۰۱۵ء، ص:۲۰

۳۔ عابد صدیق، مغربی تنقید کا مطالعہ، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۳ء، ص:۱۳۳

۴۔ جون ایلیا، گویا، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، اشاعتِ سوم، ۲۰۱۴ء، ص:۳۱

۵۔ انٹرویو، ڈاکٹر لیاقت علی موثر سے راقم کی ملاقات، بمقام گورنمنٹ کالج، ٹوبہ ٹیک سنگھ، ۶ نومبر ۲۰۰۹ء

۶۔ ہادی حسین، سید، رومانیت، مشمولہ: نظریاتی تنقید (مسائل و مباحث)، مرتبہ: ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، ملتان/لاہور: بیکن بکس، ۲۰۱۵ء، ص: ۱۰۴۔۱۰۵

۷۔ نیر، ناصر عباس، ڈاکٹر، لسانیات اور تنقید، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۹ء، ص:۱۲۳

۸۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، امتزاجی تنقید، لاہور: اُردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۷ء، ص:۶۸

۹۔ نارنگ، گوپی چند، ڈاکٹر، اُردو ما بعد جدیدیت پر مکالمہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص:۸۷

۱۰۔ شمس الرحمٰن فاروقی، تخلیق تنقید اور نئے تصورات، مرتبہ: محمد حمید شاہد، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۱ء، ص:۲۷۱

۱۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، امتزاجی تنقید، لاہور: اُردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۷ء، ص:۶۵

۱۲۔ شمس الرحمٰن فاروقی، تخلیق تنقید اور نئے تصورات، مرتبہ: محمد حمید شاہد، ص:۲۶۹

۱۳۔ نارنگ، گوپی چند، ڈاکٹر، جدیدیت کے بعد، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص:۹۴

۱۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ارسطو سے ایلیٹ تک، کراچی: نیشنل بک فاؤنڈیشن، طبع ہفتم، ۲۰۰۳ء، ص:۲۴۴

۱۵۔ عطا تراب، تخلیقی آزادی کے منکروں کے نام، مشمولہ: ادب و ثقافت، شمارہ نمبر ۱۴، امریکہ، س ن، ص:۱۳۶

☆.....☆.....☆